سرخ جنت میں قدم (دوسری قسط)

مستقبل

فرخ سہیل گوئندی

02–19–2013

انگریزی زبان کی قدر تو پاکستان سے ایران میں داخل ہوتے ہی کم ہونی شروع ہوگئی تھی لیکن ترکی میں انگریزی بول کر اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے ہر بار احساس ہوا کہ ترک اس زبان سے کس قدر نابلد ہیں۔ وہ فوراً کہتے کہ جرمن زبان میں اپنا مدعا بیان کرو۔ انقرہ کے اُلس پارک میں جب ایک ریستوران میں بیرے کو روسٹ چکن آرڈر کرنے کی انگریزی پیام رسانی میں کامیاب نہ ہوسکا تو چند جانوروں کی آوازوں کا بچپن کا سبق کام آ گیا اور میں نے ترک بیرے کو مرغ کی شان دار آواز نکال کر آرڈر دے دیا۔ قبل اس کے کہ وہ آرڈر قبول کرتا، وہ دوسرے تین چار ساتھیوں کو بھی لے آیا اور کہا کہ دوبارہ آرڈر دو۔ دوبارہ آرڈر دیا اور پھر اپنے بدن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے آدھے چکن کا آرڈر قبول کروایا۔ بلغار قوم تو ترکوں سے بھی چند قدم آگے نظر آئی جہاں صرف زبان و بیان ہی نہیں بلکہ انداز و اطوار بھی بدل گئے۔ ''ہاں'' کہنے کے لیے آپ کو سر دائیں بائیں ایسے ہلانا تھا جیسے بھارتی کلاسیکی رقاص ہلاتے ہیں اور ''نہ'' کے لیے سر کو اوپر جھٹکا دینا ہوتا ہے۔ زبان و بیان اور انداز و اطوار کے بدلنے سے احساس ہوا کہ زبانیں سرزمین بدلنے پر گونگی ہوجاتی ہیں بلکہ انسان کی جسمانی حرکات و سکنات کے بھی معنی بدل جاتے ہیں۔ زمین کے سینے پر سفر کرتے ہوئے ایسے ایسے تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں جس کا تصور ہوائی جہازوں کے سفروں سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ حیرت تھی کہ کیسے بڑے بڑے دانشور جہازوں سے سفر کر کے عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے دو چار روز کسی ہال کی چھت تلے بحث مباحثہ کرتے ہیں تو اُن پر نجانے کیسے دنیا کے علم و مشاہدات کے خزانے منکشف ہوجاتے ہیں جب کہ سرزمینوں پر سفر انسانوں کے درمیان سفر ہوتا ہے۔

صوفیہ ریلوے سٹیشن سے میں پھونک پھونک کر باہر قدم رکھ رہا تھا اور بے زبانی کے عالم میں اشاروں کی مدد سے باہر جانے کا راستہ معلوم کیا۔ خوب صورت اور نہایت صاف ستھرا ریلوے سٹیشن۔ مشرقی یورپ کی کمیونسٹ ریاست بلغاریہ کے ریلوے سٹیشن کا طرزِ تعمیر کسی صحرا میں عرب خانہ بدوشوں کے خیموں کی طرز پر بنی عمارت ہے۔ صوفیہ کا پہلا ریلوے سٹیشن عثمانی دَور میں یکم اگست 1888ء کو بنا اور اس کا پہلا سٹیشن ماسٹر ایک مسلمان یوسف کارا پیروف تھا۔ کمیونسٹ دَور میں اس پرانی عمارت کو گرا دیا گیا اور 6 ستمبر 1974ء کو ریلوے سٹیشن کی نئی عمارت یورپ بھر کی ٹرینوں کے لیے کھول دی گئی۔ صوفیہ ریلوے سٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں بلغاریہ پہنچ چکا تھا۔ میں اپنے آپ میں حیرت زدہ تھا کہ کیا یہ ممکن ہوگیا ہے۔ جب صحت مند اور خوش شکل بلغار نسل کے مرد و زن کو اپنے اردگرد دیکھا جو خاموشی اور تہذیب کے ساتھ رواں دواں تھے تو خوشی کی ایک تاعمر یاد رہنے والی لہر میرے دماغ میں گھر کر گئی۔ میرے لیے یہ زندگی کا بہت بڑا ایڈونچر تھا۔ سیاحت، مشاہدے اور سماج کے تجربات۔ صوفیہ کی خاموش پُرفضا سہ پہر۔ پیدل رواں دواں لوگ۔ پرانی طرز کی کاریں۔ دھوئیں، آلائشوں اور شور و غل سے پاک فضا۔ پُرسکون پُرامن لوگ۔ میری آنکھیں صوفیہ کی

سرخ جنت کے نظاروں میں محو تھیں۔ منظم شہر، منظم لوگ۔

میرے اس تمام سفر کا سرمایہ فقط تین سو ڈالر تھے (اُس وقت ڈالر تقریباً 14 روپے کا تھا) اور لاہور سے صوفیہ تک کا سفر میں نے بڑی احتیاط سے خرچ کرتے ہوئے کیا تھا، اگر ایک وقت کھالیا تو کافی اور یوں سارا دن چلنے پھرنے گھومنے کی طاقت حاصل کرلی۔ رات سفر میں یا سفرگاہ (ریلوے سٹیشن یا بس ٹرمینل) میں گزار کر کئی ہوٹلوں میں قیام کی بچت کی۔ میرے لیے یہ تجربات خوشی کا باعث بنے۔ تین سو ڈالروں میں سے ابھی تک پہلے ایک سو ڈالر بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ میں نے یہ معلومات حاصل کرلی تھیں کہ بلغاریہ میں ڈالرز کو غیر قانونی طور پر تبدیل کروانے میں ہی بھلا ہے کہ اس طرح دگنے سے بھی زیادہ کرنسی مل جاتی تھی، مگر پھر غیر قانونی طور پر ڈالر تبدیل کروانے پر گرفتاری بھی ممکن ہوسکتی تھی۔ میری جیب میں صرف ڈالر ہی تھے اور بلغاری کرنسی لیوا یا اس کے چھوٹے سکے Stotinka موجود نہیں تھے، اس لیے کسی ٹرام یا بس میں بیٹھا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

آفیشل کرنسی کی تبدیلی میرے بجٹ اور پروگرام کا بیڑہ غرق کرسکتی تھی۔ اپنے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے میں نے بیگ اٹھاتے ہوئے صوفیہ ریلوے سٹیشن کے باہر ایک بینچ پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور پھر دزدیدہ نگاہوں سے ''آہنی دیوار'' کے محافظوں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اتنے میں درمیانی عمر کا ایک بلغارین میرے قریب آبیٹھا۔ ''آہنی دیوار'' سے متعلق ''آزاد دنیا'' میں گردش کرنے والی کہانیاں میرے دماغ میں گھومنے لگیں۔ اجنبی بلغارین نے کہا، "You have dollars?" میں نے ہاں نہ کے ملے جلے جذبات میں کہا کہ "Yes"۔ پھر اس نے پوچھا، "You want change?" میں نے پھر جواب دیا کہ "Yes"۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ صوفیہ کے میری لوئیس بلیوارڈ پر واقع ریلوے سٹیشن کے باہر بینچ سے اٹھا اور مجرموں کے انداز میں اس نامعلوم بلغارین کے پیچھے چلنا شروع ہوگیا۔ دل میں وسوسے سے ابھرنے لگے کہ شاید یہ ٹریپ ہے۔ یہ وہی ''خفیہ والا'' تو نہیں جس کے قصے ہماری ''آزاد دنیا'' میں عام ہیں؟ میں نے پتلون کی خفیہ پاکٹ سے پچاس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔ ڈالرز کی غیر قانونی تبدیلی کے بہانے یہ مجھے کہاں لے جارہا ہے؟ کیا یہ واقعی غیر قانونی ڈالرز تبدیل کرے گا یا مجھے گرفتار کروائے گا؟ میں یہی سوچ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز اور قدم بھی تیز۔ بیگ کو اس کے ٹوٹے ہینڈل سے پکڑ کر چلنا ایک مشکل کام تھا جس نے میرے اعتماد میں کمی واقع کردی تھی۔ کبھی کبھی وہ ''منی چینجر'' پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتا اور اطمینان حاصل کرتا کہ واقعی میں اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میرے دماغ میں سینکڑوں سوالات جنم لے رہے تھے کہ اگر یہ واقعی ڈالر تبدیل کرے گا تو کیا یہ کمیونسٹ حکمرانی کو چیلنج نہیں؟ زیرزمین ڈالرز تبدیل ہوسکتے ہیں تو زیرزمین تحریکیں بھی جنم لے سکتی ہیں۔ جب سب کچھ زیرزمین ہی ہوگا تو پھر یہ نظام کیسے چل سکتا ہے؟ سرخ جنت کا مسافر، سرخ جنت کے مرکز میں دل میں خوف اور دماغ میں سوالات لیے قدم آگے بڑھاتا رہا۔ سرخ جنت کے اس شہر صوفیہ کا حُسن اپنے باسیوں کی وجہ سے جوبن پر تھا لیکن میرے دل و دماغ پر تو خوف طاری تھا کیوں کہ ہماری ''آزاد دنیا'' میں یہ خوف کوٹ کوٹ کر ہمارے دماغوں میں بھرا گیا تھا۔

صوفیہ شہر کو میں نے اپنے تصور جیسا ہی پایا کہ مشرقی یورپ کے شہر اپنے حسن و جمال میں منفرد ہیں۔ مغرب کے دوسرے شہر ان کے خاموش حسن کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور نہ وہاں کے لوگ حسین بلغار لوگوں کا۔ میں اپنے اجنبی دوست کا پیچھا کررہا تھا۔ یکدم اس نے سڑک پار کی اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک عمارت میں غائب ہوگیا۔ جی تو چاہا کہ بھاگ جاؤں مگر کہاں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آج رات بسر کہاں ہوگی۔ سڑک پار کرتے ہوئے میرے مہم جُو دل نے کہا، آر یا پار، دیکھا جائے گا، ڈالرز تبدیل ہوں گے یا سرخ جیل کی سیر ہوگی۔ اور پھر میں اس اجنبی دوست کے ساتھ عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا، پہلی منزل، دوسری، تیسری اور چوتھی منزل۔۔۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور میرے دل کے گھڑیال بج گئے، بس اب تم اپنی منزل کو پہنچے! اور گھر

کیسے اطلاع کروگے، یہ طے کرلو۔ سنا ہے جو آہنی دیواروں کی ریاستوں کی جیلوں میں جاتا ہے اس کا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ملزم غائب کہاں ہوگیا۔ گھنٹی بجتے ہی دروازہ کھلا اور ایک نہایت خوب صورت خاتون نے میرے رہنما ''منی چینجر'' کی طرف دیکھا۔ اس نے خاتون سے بلغارین زبان میں یقیناً میرا تعارف کروایا۔ خاتون نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم اس فلیٹ میں داخل ہوگئے۔ ''منی چینجر'' نے اپنی ''بلغارین انگریزی'' میں کہا کہ میرے پاس ریڈیو ٹرانسمیٹر ہے آؤ آپ کو دکھاؤں۔ میں چونک گیا، اوہ۔۔۔ تو یہ خفیہ ریڈیو سٹیشن چلاتا ہے۔ بلغارین دوست مجھے اپنے فلیٹ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ اوہ، یہ کہیں سی آئی اے کا خفیہ کارندہ تو نہیں، ریڈیو ٹرانسمیٹر ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس نے فخریہ بتایا کہ میں یہ جرمنی سے لایا ہوں۔ جب میں نے مشینری کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موصوف مشرقی جرمنی سے ایک نہایت طاقتور ریڈیو خرید کر لائے ہیں۔ دونوں مرد وزن دوبارہ ڈالرز کی تبدیلی کے موضوع کی طرف آئے۔ کتنے ڈالر تبدیل کروانے ہیں؟ ''منی چینجر'' نے پوچھا۔ میں نے کہا، دس ڈالر۔ اس کی مسکراہٹیں غصے میں بدل گئیں اور وہ مجھے اپنے فلیٹ سے نکلنے کا کہتے ہوئے بولا، ہم سو ڈالر سے کم تبدیل نہیں کریں گے۔ بس اب میرے پاس سوائے واپسی کے کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور فٹافٹ سیڑھیاں اترتے ہوئے سڑک پر آ گیا۔ صوفیہ شہر میں چہل پہل تھی اور میں اپنی منزل کی دریافت کا سوچ رہا تھا جب کہ میری جیب میں مقامی سفر کے لیے مقامی کرنسی کے سکے بھی نہیں تھے، لیکن میں نے طے کیا کہ ٹرام کا معلوم کیا جائے جو طلبا کے لیے بسائے گئے شہر Studentski Grad جاتی ہے جو دنیا میں اپنی نوعیت کی منفرد بستی تھی جہاں پر مختلف تعلیمی ادارے اور مقامی طلبا کے علاوہ، مشرقی یورپ، سوویت یونین، ویت نام، اشتراکی افغانستان اور ''آزاد دنیا'' کے سوشلسٹ رجحان رکھنے والے طلبا بھی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے اور یوں میں بغیر ٹکٹ لیے Studentski Grad جانے والی ایک ٹرام پر سوار ہوگیا۔ (جاری ہے)